ڈاکٹر رانی صابر علی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین ساہیوال۔

ڈاکٹر طاہر عباس

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور۔

ڈاکٹر واصف اقبال صدیقی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور۔

خواتین ناول نگاروں میں نظریاتی وابستگی

Dr. Rani Sabir Ali
Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. Post Graduate College for Women, Sahiwal.
Dr. Tahir Abbas
Assistant Professor Deptt of Urdu, The Islamia University, Bahawalpur.
Dr.Wasif Iqbal Siddiqui
Assistant Professor Deptt of Urdu, The Islamia University, Bahawalpur.

Ideological Affiliation in Women Novelists

The Female Novelists have, from the Advent of Pakistan, Shown the idealogical Commitment in their novels.. Its stonishing to read the novel of Khadija Mastoor, Altaf Fatima, Razia Sajjad Zaheer, Bano Qudisia & Khalida Hussain that they have such a deep understanding of the public problem and they also give their own opinions which are for the betterment of the circumstances. These novelists. Rebel against the fudel culture and polictical atrocities.They raise the questions that when this present system will be mended? In their novel they make it clear by giving the examples from international politics that how the other nations crushed down the old system with the help of strong movements.

Keywords: *Women novelist, Urdu Literature, Ideologies, Commitment.*

دنیا نظریاتی آراء پر قائم ہے ہر شے کے آغاز اور انتہاء میں کہیں نہ کہیں بنیادی اور نظریاتی مباحث موجود ہیں سائنس آرٹ اور ادب تینوں میں نظریہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے یہ کہنا کہ نظریاتی ادب اپنی اقدار میں کم حیثیت رکھتا ہے درست نہیں ہے اگر ایسا ادب نہ ہوتا تو کوئی بھی فن پارہ محدود سطح پر پذیرائی حاصل کر کے ختم ہو جاتا۔ شاعر افسانہ نگار اور ناول نگار جب بھی ایک واضح نظریاتی پلاٹ لے کر آگے بڑھتے ہیں تو ایک مخصوص جغرافیائی اور تہذیبی پس منظر کا حوالہ اس میں ضرور ملتا ہے چاہے وہ میر کی شاعری ہو یا غالب کا کلام فیض کا زنداں ہو یا حبیب جالب احمد فراز اور معاصر شعراء کی شاعری ہو کہیں نہ کہیں ان کی یہ نظریاتی وابستگی اکٹھی ضرور ہوتی ہے۔ بڑے افسانہ نگاروں مثلاً منٹو، غلام عباس، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور دیگر خواتین لکھنے والیوں کے ہاں یہ وابستگی دیکھ کر حیرانی بھی ہوتی ہے اور اُن کی وسعت نظری کی داد بھی دینی پڑتی ہے کم و بیش یہی صورت حال شاعرات کے ہاں بھی نظر آتی ہیں فکشن میں اگر ہم نظر دوڑائیں تو طویل ہونے کے باعث اس میں اتنی گنجائش ہے۔ کہ نظریاتی آغاز اور انتہاء کو مختلف نسلوں کے آگے بڑھنے سے بنتے اور بگڑتے دکھایا جائے سوچیں کیسے پیدا ہوتی ہیں؟ رویے کیسے جنم لیتے ہیں؟ تاریخ کیسے بنتی اور مرتب ہوتی ہے اور آگے کے لیے کیسے راہیں ہموار ہوتی ہیں یہ سب کچھ اُردو کی ناول نگار خواتین نے اپنے قلم کی مدد سے بہت واضح دکھایا ہے۔ الطاف فاطمہ کے "چلتا مسافر" کے کرداروں کی نظریاتی کمٹ منٹ بہت سخت ہے وہ کسی صورت اپنی جڑوں اور اپنی سرحدوں سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہتے مختلف سیاسی جماعتیں اپنے تضادات کے ساتھ اس ناول میں موجود ہیں۔ بذلل کو مکتی باہنی دکھا کر دراصل مصنفہ نے ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جو طلباء کو ملکی سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کر رہے تھے نیز وہ تفصیل سے بتاتی ہیں کہ کیسے بیوروکریٹ طبقے کے لیے اس کے سوا کوئی تفریح نہ تھی کہ وہ بنگالیوں کے خلاف بات کرے یا پھر ان کو برا بھلا کہے ایسے ہی رویے تھے جن کو محسوس کر کے بنگالی عوام کا رویہ تبدیل ہوا اور انہیں محسوس ہوا ان کا استحصال کیا جارہا ہے۔ رضیہ فصیح احمد اپنے ناول "صدیوں کی زنجیر" (۱۹۸۸) میں جغرافیائی دوری کے اسباب کا رونا روتی ہے اپنے ناول میں وہ واضح کرتی ہیں کہ بہت دکھ اٹھانا پڑتا ہے جب ایک جگہ پر رہنے والے راتوں رات اجنبی بن کر مہاجر بہاری، سندھی، پنجابی کی چادر اوڑھ لیتے ہیں ملکی سیاست کو زیر بحث لانے کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے سماجی حوالے سے ان مشکلات کو بھی بیان کیا جو جغرافیائی دوری کے سبب سامنے آئیں۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے تعلق پر رضیہ فخر محسوس کرتی ہیں مگر جب یہ فخر ختم ہوتا ہے تو کرداروں کے اندر داخلی ٹوٹ پھوٹ اور کشمکش شروع ہو جاتی ہے جس کی نمائندگی زری اور عمر خاں کرتے ہیں ناول میں مختلف نسلوں قبیلوں اور گروہوں کے لوگ ہیں جو اپنی شناخت سے دور ہو رہے ہیں رضیہ

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

ناول کے آغاز سے آخر تک اپنے نظریے پر قائم ہے کہ اندرونی سازشوں نے پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا سیاسی رہنماؤں کی آپس کی چپلش مختلف تحریکوں اور تنظیموں کے بننے اور بگڑنے کے اسباب ناول کا وسیع کینوس اپنے اندر پوری طرح سموئے ہوئے ہے۔

> "صدیوں کی زنجیر (۱۹۸۸) میں رضیہ فصیح احمد نے مشرق پاکستان کو دہرے استحصال کی بدولت بنگلہ دیش بنتے دیکھا اور دکھایا ہے مشرقی سامراج سے آزادی ۱۹۴۷ء میں تاہم ۱۹۷۱ء تک مغربی سامراج کے معنی بدل گئے تھے۔ ان کے نزدیک مغربی پاکستان ہی مغربی سامراج تھا آزادی کے بطن سے آزادی کا نیا سورج طلوع ہوتا ہے تاہم بنگلہ دیش بن جانے کے بعد بھی خون کے غسل کا سلسلہ بند نہیں ہوتا۔"(۱)

اُردو ناول کا ذکر ہو اور خدیجہ مستور (۱۹۲۶) کا نام نہ آئے یہ کیسے ممکن ہے خدیجہ نے جو لکھا دوسروں سے ہٹ کر لکھا، اپنی ایک الگ راہ بنائی اور دوسرے فنکاروں کو بھی اس راہ پہ چلنے کی ترغیب دی اُن کے ناول "آنگن" اور "زمین" اپنی مقبولیت میں آج بھی پہلے دن ہی کی طرح سے ہیں۔ آج بھی ان کو پڑھ کر اس دور کی یاد ذہن میں تازہ ہونے لگتی ہے۔ خدیجہ کے قلم کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ ہر ہر مکالمہ کرداروں کی زبان سے خود بخود نکلتا ہے اور فٹ ہو جاتا ہے۔

"آنگن" ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جس کے سارے کردار سیاسی پس منظر کی لپیٹ میں ہیں۔ وہ یا تو کسی جماعت سے تعلقات رکھتے ہیں یا پھر اپنی نظریاتی وابستگی کسی کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ناول کا آغاز بہت عام سے انداز سے ہوتا ہے اور دیکھنے میں یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی ڈائجسٹ کی کہانی شروع ہو رہی ہے۔ لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں احساس ہوتا ہے کہ ہر فرد حالات وواقعات کے بارے میں کس قدر گہری بصیرت رکھتا ہے بیرونی سیاست نے گھر کی اندرونی سیاست پر ایسے اثرات ڈالے کہ سب کچھ بدل گیا۔

اب کیا ہو گا یہ سوال ایک ڈر اور خوف بن کر کرداروں کے اندر موجود ہے سماجی ڈھانچہ اسی سوال کے اندر دکھائی دیتا ہے اس سماج میں صفدر بھائی، تہمینہ، چھمی، جمیل اور عالیہ کے کردار ایک عجیب جبر کا شکار بن کر رہ جاتے ہیں۔ نظریات کی شکست انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے کیونکہ پاکستان بنتے وقت گھروں کے ٹوٹنے کے عمل نے کرداروں کو اندر سے کھوکھلا کر دیا یہ داخلی شکست اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب آئیڈیل آنکھوں کے سامنے

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

زیر و ہو کر گر جاتا ہے۔ ناول کے آخر میں ہیر وئین عالیہ کے اندر اس لیے شکست کا احساس بڑھ جاتا کہ جب اس کا آخری سہارا صفدر بھی اپنی خواہشات کا غلام بن کر اس سے پیار کا اظہار کرتا ہے۔ ناول کے آخر میں کردار جس طرح سے نظریاتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے اور زندگی سے جس طرح بیزار ہوئے اس کی ترجمانی مصنفہ نے صفدر کے ان مکالموں کے ذریعے کی ہے۔

> "دنیا تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے مجھے کوئی مطلب نہیں۔۔۔۔۔۔ اب صرف دولت کماؤں گا عیش کروں گا میں کار کوٹھی کے خواب پورے کروں گا میں اب جیل نہیں جاسکتا"(۲)

آنگن میں ایک ہی گھر میں رہنے والے افراد مختلف سیاسی جماعتوں سے وابستہ ہیں سماجی رویے اور سماجی ہمدردیاں بٹی ہوئی ہیں باپ اگر کانگریسی ہے تو بیٹا مسلم لیگی، اس دور کی سیاست کا تصادم بھی ایسا تھا کہ خونی رشتے بھی ایک دوسرے کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے باپ کے جیل جانے پر جمیل کہتا ہے کہ۔

> "یہ کانگریسی لیڈر تو جیسے جیل جائے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتے خالص ہندوؤں کی جماعت کے لیے اتنی قربانیاں دے کر جانے انہیں کیا مل جائے گا کس قدر ہندو طبیعت ہے ان صاحب کی بھی کیسے کیسے ہندو مسلم فساد ہوئے مگر اُن پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔"(۳)

آنگن میں سیاسی و سماجی رویے بڑی خوبصورتی سے بیان کیے گئے ہیں اور ناول پڑھ کر مصنفہ کے قلم کی داد دینی پڑتی ہے کہ کیسے ایک ہی گھر کے مختلف افراد کے ذریعے انہوں نے سیاسی جماعتوں کی حقیقت کھولی اور ان کے سیاسی نظریات واضح بیان کئے۔

> "یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ "آنگن" کی ساری کی ساری نئی نسل کانگرس کے اس سیاسی اور تہذیبی مسلک کے خلاف شمشیر برہنہ ہے۔ صفدر بھائی علی گڑھ یونیورسٹی سے اُس گھر میں واپس آنے کی بجائے کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن بن جاتے ہیں جہاں ان کا غریب کسان کا بیٹا ہونے کا جرم کسی طور معاف نہ ہو سکا تھا۔"(۴)

خوابوں کے ٹوٹنے کے عمل نے کرداروں کو اندر سے کھوکھلا کر دیا یہ داخلی شکست اُس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب آئیڈیل آنکھوں کے سامنے زیروہو کر گر جاتا ہے سیاسی و عمرانی اور ثقافتی تصادم آنگن میں بہت واضح ہے اور یہ خدیجہ ہی کا کمال ہے کہ ایک ہی پلاٹ میں اختصار کے ساتھ ہندو مسلم معاشرے کی عکاسی کی۔ اس ناول میں صرف سیاست ہی زیر بحث نہیں بلکہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ معاشرتی تبدیلیاں کیسے انسانوں کے ذہنوں کو بدل کر رکھ دیتی ہیں اور جب انسان ایک نئے سماج کی تشکیل کرنا چاہتا ہے تو بہت سی رکاوٹیں اس کے سامنے آتی ہیں جن کو دور کرتے کرتے اس کی اپنی شخصیت محرومی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اُن کے ناول ''زمین'' کی کہانی خوابوں کے ٹوٹنے کے عمل پر مبنی ہے منفی رویے کرداروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے اندر سے اپنی سرزمین کے لیے وفا کو ختم کر دیں دورہ ساجدہ بے شمار لوگوں کی مدد کرتی ہے جو پاکستان بننے کی منزل میں اس کے سامنے آتے ہیں تاہم ناظم جب اس کی زندگی میں داخل ہوہے تا تو منفی رویے سامنے آنے لگتے ہیں ناظم کو صرف شک کی بنیاد پر بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے مگر ساجدہ کا پھر بھی اسے یہ کہنا کہ کسی ایک کی قربانی سے پاکستان بچ سکتا ہے تو اسے بچانا چاہیے وہ کہتی ہے کہ پاکستان کی شکل صرف اس کے سماجی رویے ہی بنا سکتے ہیں صرف انسان ہی اسے ایک خوبصورت شکل فراہم کر سکتا ہے۔ خدیجہ مستور کا ''ذمین'' دارصل '' آنگن ''کی توسیع معلوم ہوتا ہے جیسے صفدر ناول کے آخر میں مادیت پسندی کی طرف چلا جاتا ہے اسی طرح سے یہ کردار اپنے اصل مقاصد بھول کر صرف اور صرف حصول دولت میں لگ جاتے ہیں۔ سماجی قوانین کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں اور ان کی دھجیاں بڑے اعتماد سے اڑائی جاتی ہیں اس مثال میں کاظم کا نام بلا جھجک لیا جا سکتا ہے مظلوم نوکرانی سے اُس کا مکروہ فعل اور اس فعل کے نتیجے میں جو کچھ ہوتا ہے دل کو وہلا کر رکھ دیتا ہے۔

بانو قدسیہ کا'' حاصل گھاٹ ''(۲۰۰۳)ایک ایسی نسل کی کہانی ہے جو پاکستان کے شہر لاہور کے علاقے ساندہ کلاں سے امریکہ شفٹ ہو جاتے ہیں اور وہاں کی مشینی زندگی میں کچھ اس طرح سے گم ہو جاتے ہیں کہ روبوٹ بن جاتے ہیں ناول کا آغاز ہی امریکی زندگی سے ہوتا ہے اور مرکزی کردار ہمایوں فرید ایک بوڑھا ہے جو اپنی بیٹی اور داماد کے پاس امریکہ میں رہ رہا ہے جہاں اسے لاہور کے وہ مرغن کھانے اور آسائشوں بھری زندگی نہیں ملتی، ہر شخص بھاگ دوڑ میں ہے اور ترقی کرنا چاہتا ہے وہ لوگ جو پاکستان سے آتے ہیں بڑی مشکل سے اپنی زندگی کو بناتے ہیں اور پیچھے پلٹ کر دیکھنا بھول جاتے ہیں۔ از حمند اور بلال اس مشینی زندگی میں اتنے کھو چکے ہیں کہ اپنا لباس جو وہ

پاکستان میں پہنچتے ہیں اسے ترک کر چکے ہیں وہ سہولیات جن کے وہ پاکستان میں عادی ہیں اب ان کو تکلیف محسوس ہوتی ہیں سسر کے یہ کہنے پر کہ تم لوگ روبوٹ بن چکے ہو بلال جواب دیتا ہے۔

"پاکستان امیروں کی جنت ہے ابا جی۔۔۔۔۔ امریکہ غریبوں کی بہشت ہے یہاں غریب آدمی عزت نفس سے محروم نہیں ہوتا وہ نہ اپنے آپ کو کسی سے کمتر سمجھتا ہے نہ ہی کمتر ہوتا ہے آپ کے دیس میں۔۔۔۔۔۔۔۔

ناول کا تعلق اس نسل سے ہے جو پاکستان سے مایوس ہو چکی ہے۔ کیوں کہ پاکستان میں ان کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے تھے۔ نہ ہی ان کے اتنے وسائل تھے کہ وہ اپنا کوئی کاروبار شروع کرتے۔ نوجوان نسل کا نظریہ اس ناول میں یہی رہتا ہے کہ پاکستان میں اسی قوم نے ترقی کی ہے جو یا تو تجارت پیشہ تھی یا پھر بیورکریٹس۔ عام آدمی پاکستان میں رہ کر صرف تنگدستی کی زندگی گزارتا ہے جیسے بدلنے کے لیے لوگ یورپی علاقوں میں آنا پسند کرتے ہیں مرکزی کردار کے ذہن میں مشرق اور مغرب کے تفاوت کی جنگ چھڑ جاتی ہے کہ مشرق اور مغرب دو الگ الگ دھارے ہیں جو کبھی نہیں مل سکتے۔ نہ مزاج میں نہ موسم میں اور نہ نسلاً کیوں کہ ہر چیز مختلف ہے۔ مصنفہ حیرت سے سوچتی ہے کہ امریکہ کو ڈاکوؤں کی سرزمین کہا گیا ہے ان کی نسل ایک نہیں ہے پھر بھی یہ کامیاب زندگی گزارنے کے اصول اور ترقی کا راستہ ان میں پتا نہیں کیسے آگیا۔

مصنفہ نے اس ناول میں بہت ساری نظریاتی بحثیں بھی پیش کی ہیں جس میں اقلیتی معاشرے پر بحث بھی ہے۔ اقلیت کو وہ مقام حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ اکثریتی معاشرے کو مسلمان قوم کے بارے میں مصنفہ کہتی ہے کہ برصغیر میں ان کو اپنی اقلیت کے ہونے کا احساس اس لیے نہ ہوا تھا کیوں کہ وہ صدیوں سے بادشاہ رہے تھے اور شان و شوکت سے بھری زندگیاں گزار کر آئے تھے۔ لیکن امریکہ اور یورپین ممالک میں اقلیت اپنے آپ کو عدم تحفظ کا شکار سمجھتی ہے اور چاہے لاکھ کوشش کرے وہ اس خوف سے نجات حاصل نہیں کر سکتی۔ اپنے اس خوف سے پیچھا چھڑانے کے لیے اقلیتیں اس ملک و مذہب کا ہر موسم اپنانے کی کوشش کرتی ہیں اپنا رنگ نسل اور مذہبی تقاضے بھلا کر اسی ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن پھر بھی سکون نہیں ملتا ہے اور غیرت کا احساس ہر طور پر اقلیتی نسل کے اندر موجود رہتا ہے۔

"یہ تم نے اپنی شلوار قمیض کیوں چھوڑ دی ارجمند؟۔۔۔۔۔۔ ارجمند کچھ دیر منہ میں زبان گھماتی رہی شاید وہ مجھے اپنی زبان سے زخمی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بات یہ

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

ہے ابو۔۔۔۔ انسان کو پانی کی رو کے ساتھ بہنا پڑتا ہے شلوار قمیض میں بہت odd محسوس کرتی ہوں۔۔۔ **Main stream** سے کٹ جاتا ہے آدمی لیکن اپنی شناخت تو رہتی ہے ناں ارجمند۔۔۔، ہاں رہتی تو ہے ابو۔۔۔۔ لیکن اگر لوگ اس شناخت کے باعث آپ سے نفرت کرتے ہوں، آپ کو کمتر جانتے ہوں تو پھر اپنا لباس چھوڑنا پڑتا ہے نیا چولا پہننا پڑتا ہے۔"(۵)

اس ناول میں آنے تک بانو کی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے "شہرِ بے مثال"، "راجہ گدھ" میں صرف لاہور کی زندگی اس کے مسائل اور انسان کی المناکی دکھائی ہے۔ لیکن " حاصل گھاٹ "تک آتے آتے یوں لگتا ہے کہ جیسے بانو کے پاس معلومات کا وسیع ذخیرہ آگیا ہے جو کہانی کے پلاٹ میں جگہ جگہ کرداروں کے مکالمے روک کر سامنے آجاتا ہے امریکی زندگی، افراد کے مسائل، دیہات کی کشش، کرداروں کے اندر کی خواہشات اور رشتوں کی تلخیاں اور سچائیاں ناول نگار نے بڑی وضاحت سے پیش کی ہیں۔

مصنفہ کا سیاسی شعور اس ناول میں بہت واضح ہے پاکستان میں ہونے والے سیاسی واقعات اور توڑ پھوڑ اسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں خاص طور پر افغانستان کی صورت حال اور ۱۱ ستمبر کے واقعات کرداروں کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع کر دیتے ہیں۔

"اگر تم واپس جانا چاہتے ہو تو کہاں جاؤ گے۔، افغانستان کہ پاکستان اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں گیار ستمبر سے پہلے بہت لبرل تھا بابا جان کیوں کہ میں کسی خیال مسلک، مذہب، ملک خاندان سے وابستہ نہیں تھا نہ میری جڑیں کہیں تھیں نہ میرا دماغ کہیں تھا۔"(۶)

۱۱ ستمبر نے جس طرح لوگوں کے اندر غم و غصہ اور جزبات لہرا پیدا کر دی تھی اور وہ حیران تھے کہ آخر اتناسب کچھ اچانک کیسے ہو گیا کہ انسانیت افغانستان میں چوہوں کی طرح کٹ کٹ کر اور گر گر کر مر رہی تھی۔ صرف ایک الزام اور اس کے بعد سزا کا عمل شروع ہو گیا۔ یہ وہ کردار ہیں جو نام نہاد دہشت گردی کی جنگ میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے ہیں۔ بم بلاسٹ اور فرقہ واریت کے تحت ہونے والی تشدد پسندی نے ان سے سب کچھ چھین لیا ہے۔

امریکی زندگی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ جس گہرے بین الاقوامی سیاسی شعور کو مصنفہ بیان کرتی ہے وہ حیران کر دیتا ہے خاص طور پر یورپین ملکوں اور امریکہ کی زندگی کا تضاد، رسم و رواج کی اچھائیاں برائیاں، ترقی کرتے ہوئے معاشروں کی خرابیاں اور مشرق و مغرب کے درمیان ٹوٹتی روحانی قدروں کا نوحہ۔ روس کے بننے بگڑنے اور ٹوٹنے کو وہ گہری نظر سے دیکھتی ہیں۔ سپر پاورز جس طرح سے غریب ملکوں کا استحصال کرتی ہیں اور اپنی اہمیت جتانے کے لیے احکامات صادر کرتی ہیں وہ ناپسندیدہ ہیں یہ طاقتیں اپنے زور اور دباؤ کے ذریعے ساری دنیا پر قبضہ کر لیتی ہیں۔ مصنفہ نے یہ بھی واضح کیا کہ یورپی اقوام نے لگے بندھے اصولوں سے کھل کر اختلاف کیا اور علم بغاوت بلند کیا۔ سوویت یونین پولینڈ، بلغاریہ اور چیکوسلواکیہ نے اپنی نظریاتی سرزمین کو صرف اپنی مضبوط تحریکوں کے ذریعے منوایا وہ اس بات پر کڑھتی ہیں کہ پاکستان میں ابھی تک کوئی واضح سیاسی نظام اور سماجی شعور پیدا نہ ہو سکا۔

یہ سارے خارجی حقائق ناول نگار جس طرح سے بیان کرتی ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ پاکستان کے تخلیق کاروں کا ذہنی سفر بھی آگے کی جانب بڑھتا رہا اور خیالی دنیا کو چھوڑ کر انھوں نے حقائق کی دنیا میں نا صرف یہ کہ قدم رکھا بلکہ دوسروں کو بھی دعوت دی کہ وہ اس صف میں کھڑے ہو جائیں۔

اکیسویں صدی میں خالدہ حسین(۱۹۳۸) نے اردو ناول نگاری کو بیانیہ انداز تحریر کا اچھوتا نمونہ کاغذی گھاٹ(۲۰۰۳) کی شکل میں دیا ہے اس ناول میں ان کا انداز اپنے افسانوی اسلوب سے بہت مختلف ہے کیوں کہ ناول کے واقعات ملکی سیاست سے لیے گئے ہیں اور سماجی اصولوں اور کرداروں کے نظریات کے بیان کے لیے یہی سیدھا سادہ اسلوب بہتر تھا ناول کا آغاز ہی نظریاتی بحثوں سے ہوتا ہے۔ اور مونا کی سوچ کا محور صرف پاکستان ہے۔ ایک ایسا پاکستان جو جمہوری تقاضوں پر مبنی ہوا اور جہاں پر منافقت نہ ہو بلکہ صاف ستھری اور شستہ سیاست ہو مونا بہت دکھ محسوس کرتی ہے۔ جب کوئی ایسا کام کرتا ہے جو ملکی وقار کے منافی ہو وہ سوچتی ہے کہ کس قدر جدوجہد اور قربانیوں سے یہ ملک عزیز حاصل ہوا ہے اگر چھوٹی چھوٹی باتیں یونہی اس کے وقار کے منافی ہوتی رہیں تو پھر یہ جلد ہی اپنے ساکھ کھو دے گا۔ ناول میں ہونے والی بحثیں ملک میں بننے والی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں کو سامنے لے کر آتی ہیں اور ساتھ ہی حکمران اور بیوروکریٹ طبقے کی سوچ بھی واضح کرتی ہیں یہ بیوروکریٹ فوج بندوق تو نہیں رکھتے مگر ملک کا سارا انتظام ان کے ہاتھوں میں ہونے کی وجہ سے سیاسی حکومتیں بنانے اور گرانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ان میں منفی طاقتوں کا مضبوط ہونا ملک کی تباہی کا اصل سبب ہوتا ہے یہ بیوروکریٹ طویل عرصہ ملازمت میں رہتے ہیں

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

اور مدت ملازمت پوری ہونے کے باوجود ضرورت کے نام پر اپنی نوکریوں میں توسیع لے کر بڑی بڑی سیٹوں پر براجمان رہتے ہیں اور سماج کے عام لوگ انہی کے بنائے ہوئے اصولوں پر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

”جس بنیادی تصور پر یہ ملک حاصل کیا گیا۔ ہماری نظریاتی سرحدوں کا تحفظ ضروری ہے سامراجی ذہنیت کا خاتمہ کرو اور یہ سب کچھ اپنی زبان اپنائے بغیر نہیں ہو سکتا ہم ذہنی طور پر ابھی تک غلام ابن غلام “(۷)

مصنفہ جب ملکی حالات دیکھتی ہے تو اس کے اندر یہ گہرا شعور ابھرتا ہے کہ پاکستان میں آنے والی فوجی حکومتوں نے پاکستان میں ترقی کا عمل کافی سست کر دیا تھا، عوام اتنے بھولے تھے کہ جب کوئی نئی حکومت آتی تو وہ خوش ہو جاتے کہ شاید اب ان کے دن بدلنے والے ہیں مگر جلد ہی وہ فوج اور اس کی لگائی ہوئی پابندیوں سے بیزار ہو جاتے۔

”ایوب خان کی وجاہت نے سب کے دلوں میں جھنڈے گاڑ دیئے تھے، وہ فوجی تھا یہ تو کبھی خیال ہی نہ آتا۔۔۔۔ دراصل غلام محمد اور خواجہ ناظم الدین کے بعد ایسا خوش وضع بہت ہی خاص نظر آنے لگا تھا۔ مارشل لاء ایک آزاد قوم کے لیے باعث ندامت ہے اس کا انہیں کب ہوش تھا۔“(۸)

ان سطروں میں مصنفہ ایوب دور کے مارشل لاء کی طرف لوٹ جاتی ہیں جب ہر طرف اس حکومت کی دھوم مچ گئی تھی لوگ سمجھتے تھے کہ اب ان کے دکھوں کا مداوا ہونے والا ہے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ فوجی حکومت جب آتی ہے تو تھوڑرے عرصے کے لیے آتی ہے مگر اس کے آمرانہ پنجوں کا اثر آنے والے سالوں تک قائم رہتا ہے اسی آمرانہ نظام تلے مزدور اور کسان یونین متحرک ہو رہی ہے اور حقوق کے لیے جنگ کر رہی ہے۔

اُردو کے تنازع پر سیاست دانوں اور بیوروکریٹس میں جو تحریک شدت سے چلی مصنفہ نے بڑی وضاحت سے اس کا ذکر کیا کہ اردو کے لیے ضروری نہیں کہ انگریزی کو ختم کیا جائے اور نہ ہی اس میں سر کھپانے کی ضرورت ہے قائد اعظم پہلے ہی اس کو سرکاری زبان قرار ادے چکے ہیں دراصل بیوروکریٹ طبقے نے انگریزی کو فروغ دے کر عام طبقے کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا مصنفہ کہتی ہیں اردو تو قائم رہے مگر انگریزی پر بھی عبور ہونا چاہیے۔

اُن کے نزدیک روشن خیالی یہ نہیں ہے کہ مذہب سے دور ہوا جائے بلکہ قرآن مجید میں جس قدر روشن خیالی موجود ہے وہ دُنیا کے کسی اور مذہب میں نہیں ناول میں ۶۵ء میں ہونے والی جنگ کا ذکر ہے اور جس طرح ہر محاذ پر فوج کو کامیابی حاصل ہو رہی تھی اس کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مختلف محاذوں پر دشمنوں نے جس طرح حالات خراب

کیے تھے۔ اس کو بھی بیان کیا ہے۔ اُس کے بعد ناول کی کہانی میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے تصادم کو لا کر شاہجہان کو دکھایا جاتا ہے۔ جو اپنے نظریات جو کہ صرف انقلابی ہیں اُن کو یوں بیان کرتی ہے کہ پاکستان میں اُس دور میں ہونے والے الیکشن سے پہلے مشرقی پاکستان کے لوگوں کا موقف واضح ہو جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی و سماجی حقائق پر ان کی گرفت کس قدر گہری ہے ناول اپنے آغاز سے وسط اور اختتام تک پورے پاکستانی سماج اور اس کی نفسیات کی عکاسی کرتا ہے۔

> "وہ ۱۹۷۷-۷۹ کے سال تھے ملک میں مارشل لگا تھا عسکریوں نے شہریوں کو یرغمال بنا دیا تھا نعروں پر قید اور تعزیریں تھیں جلسئہ کرنے پر کوڑے تھے، ہزاروں جوانوں نے انصاف کا دروازہ کھولنے کے نام پر اور جمہوری حقوق طلب کرنے پر زنداں اور تعزیر دیکھے یہی وقت تھا کہ جب دانشور انعام واکرام کے انتظام میں بیٹھے رہے عوام کو اُن کی حمایت کی ضرورت تھی لیکن سبھی نے مصلحت کے جامے پہن لیے"(۹)

"کاغذی گھاٹ" میں مصنفہ دکھاتی ہے کہ تمام تر ترقی کے باوجود سماج کا ذہن ویسے کا ویسا ہے بیرون ملک سے تعلیم حاصل کرنے والے بھی پاکستان آ کر ویسے جاگر دار بن جاتے ہیں جیسے کہ اُن کے آباءواجداد تھے۔

جاگیر دار پارٹیاں اور سرمایہ دار مزدوروں، مزارعوں اور غریب کسانوں کی حالت کو بہتر کرنے کے لیے وعدہ تو کرتے ہیں مگر یہ وعدے کبھی مکمل نہیں ہوتے لیکن اس سے جاگیر داری نظام کو کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ پیسے اور دولت کی طاقت کے باعث وہ ہر سال الیکشن جیت کر ان کے سر پر مسلط ہو جاتے ہیں۔

> "تمہیں معلوم ہے وہاں موروثی جائیدادیں بچانے کے لیے لڑکیوں کا نکاح قرآن سے کر دیا جاتا ہے۔ اور وڈیرے جن کے ذاتی زنداں اور عقوبت خانے ہیں اور حرم اور بیگار کیمپ، ان میں سے اکثر نے یورپ کی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں لے رکھی ہیں۔"(۱۰)

ناول کے آخر میں مصنفہ پاکستانی سیاست کے بھونڈے انتظام کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کو الگ ہوتا دکھاتی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس ناول کے سارے آدرشی اور بنیادی کردار، دل افروز، جمال، مونا اور عائشہ اپنے نظریات سے خوف محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں یہ دیکھ کر تاسف ہوتا ہے کہ آغاز میں وہ

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

اپنے بلند و بانگ نعروں کے ساتھ انقلابی تھے مگر سماجی اور روایتی اصولوں کے ہاتھوں آخر کار انہیں ہارنا پڑا کیوں کہ اس ہار میں بھی ان کی جیت تھی معاشی الجھنوں کے ساتھ نظریات آگے نہیں بڑھ سکتے اس لیے شاہجہان، اور عائشہ اپنے لیے ایک آسودگی بھری زندگی کا انتخاب کرتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ خدیجہ مستور، آنگن (لاہور: التحریر اردو بازار، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۶۵۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۶۰۔

۳۔ فتح محمد ملک، ”آنگن ایک سیاسی حوالہ“، مشمولہ: فنون (لاہور: شمارہ نمبر ۲۲، جنوری ۱۹۸۴ء)، ص ۹۹۔

۴۔ محمد عارف، ڈاکٹر، اردو ناول اور آزادی کے تصورات (لاہور: مکتبہ جدید پریس، ۲۰۰۶ء)، ص ۹۴۹۔

۵۔ بانو قدسیہ، حاصل گھاٹ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۳۸۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۸۷۔

۷۔ خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۸۸۔

۸۔ ایضاً، ص ۹۸۔

۹۔ طاہر محمد خان، ”احمد فراز سماجی رویہ اور مزاحمتی شاعری“، مشمولہ: اخبار اُردو (جلد ۲۵)، ص ۱۴۰۔

۱۰۔ خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۴۱۔